حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم
نائب رئیس ——— جامعہ دارالعلوم کراچی

یادیں

(چھٹی قسط)

جیسا کہ پہلے عرض کر چکا ہوں، دیوبند میں حضرت والد صاحب، رحمۃ اللہ علیہ، نے دارالاشاعت کے نام سے ایک تجارتی کتب خانہ قائم فرمایا تھا جو وہ دیوبند ہی میں چھوڑ آئے تھے، اور بھائی جان (جناب محمد زکی کیفی، رحمۃ اللہ علیہ) اُس کی دیکھ بھال کرتے تھے، مگر اُس کی آمدنی بھی اول تو معمولی سی تھی، دوسرے اُس کو پاکستان منتقل کرنے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ حضرت والد صاحب، رحمۃ اللہ علیہ، نے نہ جانے کس طرح کچھ چھوٹے چھوٹے رسالے پاکستان آنے کے بعد بھی اُس دور میں چھپوائے، لیکن یہ وہ دور تھا جب اردو جاننے والے مہاجرین لٹے پٹے پاکستان آرہے تھے، اور ان کے لئے سب سے بڑا مسئلہ خود اپنے کھانے پینے اور رہائش کا انتظام کرنا تھا، اس لئے اردو کتابوں کی مانگ اتنی نہ تھی کہ وہ طباعت واشاعت کا خرچ نکالنے کے بعد کچھ آمدنی بھی پیدا کرسکیں۔

اس معاشی صورت حال کے ساتھ حضرت والد صاحب، رحمۃ اللہ علیہ، کو ہر وقت یہ فکر بھی لاحق تھی کہ وہ اپنی ضعیف والدہ صاحبہؒ کو دیوبند چھوڑ کر آئے تھے، جو حضرت گنگوہی، قدس سرہ، سے بیعت تھیں، اور ہم نے اُنہیں زندگی بھر کبھی ذکر اللہ سے خالی نہیں پایا، یہاں تک کہ اُن کے ہر سانس کے ساتھ "اللہ اللہ" کے الفاظ ہم خود سُنا کرتے تھے۔ حضرت والد صاحب، رحمۃ اللہ علیہ، چاہتے تھے کہ اُنہیں جلد از جلد یہاں بلانے کا کوئی انتظام کیا جائے۔ وہ ریل کے سفر کی متحمل بھی نہیں تھیں۔ اس کے علاوہ ہمارے بھائی جان ہمارے دیوبند کے گھر میں اکیلے رہ گئے تھے، ان کی عمر بھی اُس وقت بائیس چوبیس سال کی تھی، اور دارالاشاعت کا سارا انتظام بھی وہی کرتے تھے۔ والدین اور بہن بھائیوں سے دور رہ کر تنہائی میں اُن کے کیا جذبات تھے؟ اس کا کچھ اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ اسی دوران جب عید آئی تو اُنہوں نے ہم بہن بھائیوں کے نام ایک کارڈ پر ایک نظم میں اپنے جذبات کا اظہار کیا تھا جس کے یہ شعر مجھے اب بھی یاد رہ گئے ہیں:

مانا کہ میں دل درد کا خوگر ہی بنالوں
لیکن جو خلش چھپ نہ سکے، کیسے چھپالوں
تم عید کی خوشیوں سے کرو گھر میں چراغاں
میں اپنا ہی دل اپنے ہی داغوں سے سجالوں
ماں باپ جدا، بھائی بہن پاس نہیں ہیں
ایسے میں بتاؤ کہ میں کیا عید منالوں؟

حضرت والد صاحب، رحمۃ اللہ علیہ، کو تیسری فکر یہ تھی کہ ہم چاروں بھائی جو ساتھ پاکستان آئے تھے، تعلیم کے محتاج تھے، اور اُس وقت کراچی میں صرف ایک مدرسہ تھا جو محلّہ کھڈہ میں مظہر العلوم کے نام سے معروف تھا وہ ہمارے گھر سے اتنا دور تھا کہ اُس میں تعلیم حاصل کرنا ہمارے لئے قابل عمل نہیں تھا۔

اُدھر حضرت والد صاحب، رحمۃ اللہ علیہ، کو سب سے بڑی تکلیف یہ تھی کہ یہ علاقہ جس میں ہم آکر آباد ہوئے تھے، زیادہ تر انگریزوں اور پارسیوں کا علاقہ تھا، اور جو تھوڑے بہت مسلمان یہاں آباد تھے، وہ بیچارے بھی الّا ما شاء اللہ دین کی کوئی خاص فکر نہیں رکھتے تھے، اس لئے اس علاقے میں دور دور تک کوئی مسجد نہیں تھی۔ شروع میں حضرت والد صاحب، رحمۃ اللہ علیہ، جماعت میں شامل ہونے کی خاطر دور دور بھی تشریف لے جاتے، لیکن پھر انہوں نے ہمارے گھر کے تقریباً سامنے کچھ مسلمانوں کے تعاون سے ایک کیبن بنوادیا، جس میں پانچوں وقت کی نماز باجماعت شروع ہوگئی، اور پھر رفتہ رفتہ مسجد کے لئے اس کے برابر والی گلی میں ایک جگہ بھی مل گئی، جہاں الحمدللہ باقاعدہ مسجد بنی، اور وہ ابتک چلی آتی ہے۔

مزید مسئلہ یہ بھی تھا کہ مہاجرین کے قافلے روز بروز کراچی پہنچ رہے تھے، اُن میں سے کچھ اپنے رشتہ دار بھی تھے، اور ان کا حضرت والد صاحب، رحمۃ اللہ علیہ، کے سوا کوئی سہارا نہیں تھا، اس لئے وہ بھی تقریباً مستقل مہمان کے طور پر ہمارے گھر ہی میں ٹھہرتے، اور ان کو روزگار دلانے کی کوشش بھی حضرت والد صاحب، رحمۃ اللہ علیہ، کے فرائض میں شامل تھی۔ اس کے علاوہ بھی وہ لٹے پٹے مہاجرین کی ہر ممکن امداد کی کوشش فرماتے تھے۔

غرض حضرت والد صاحب، رحمۃ اللہ علیہ، کو طرح طرح کے مسائل کا سامنا تھا اور اب ہمارے لئے یہ اندازہ لگانا بھی مشکل ہے کہ اُنہوں نے کس کس طرح ان حالات کا مقابلہ فرمایا، لیکن ہمارے لئے وہ ایک

انتہائی شفیق باپ تھے جو گھر والوں کے سامنے ہمیشہ مطمئن اور خوش وخرم نظر آتے، بلکہ ہم لوگوں کی دلداری کے لئے ہمیں سیر وتفریح کو بھی لے جاتے۔ اُس وقت کراچی میں سمندر کی تفریح کیلئے سب سے دلکش جگہ کلفٹن تھی جسے اُس وقت زیادہ تر "ہوا بندر" کہا جاتا تھا۔ چونکہ وہ شہر سے بہت دور جگہ سمجھی جاتی تھی جہاں بسیں بھی بہت کم جاتی تھیں، اس لئے دن کے وقت وہ اکثر سنسان اور پُرسکون ہوتی تھی، حضرت والد صاحب، رحمۃ اللہ علیہ، ہم سب گھر والوں کو اُسی وقت وہاں لے جاتے۔ آج جس جگہ بڑا سا پارک بنا ہوا ہے، اُس وقت سمندر وہاں تک آیا کرتا تھا، اور وہ قدیم پُل جو اب پارک کے مشرقی حصے سے مغربی حصے تک پھیلا ہوا ہے، سمندر کی موجیں اُس پُل کے اگلے حصے کے نیچے تک آیا کرتی تھیں۔ یہاں ہم لوگ سمندر کی موجوں میں اپنی اپنی بساط کے مطابق نہاتے، اور گھر سے لایا ہوا کھانا دوپہر کے وقت وہیں کھا کر واپس لوٹتے۔ اسی طرح حضرت والد صاحب، رحمۃ اللہ علیہ، کبھی ہمیں بادبانی کشتی میں سوار کرکے کیماڑی سے منوڑہ لے جاتے، اور دن بھر کی یہ تفریح ہم بچوں کیلئے بڑی پُرکیف ہوتی تھی۔

ایک طرف تو مذکورہ بالا مسائل کے باوجود وہ ہماری دلداری کیلئے اس قسم کی تفریحات کا بھی سامان فرماتے، (اور ان تفریحات کے دوران بزرگوں کے واقعات اور نصیحتوں کے ذریعے ذہن سازی بھی کرتے جاتے۔) دوسری طرف حضرت والد صاحب، رحمۃ اللہ علیہ، کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے جو علمی ذوق عطا فرمایا تھا، اُس کی بنا پر خالص علمی اور فقہی مشغلے کسی حال نہیں چھوٹے۔ اگرچہ دارالعلوم دیوبند کے صدر مفتی کی حیثیت سے آپ مدت پہلے استعفاء دے چکے تھے، لیکن لوگ اطرافِ عالم سے اُن کے پاس فقہی سوالات بھیجتے رہتے تھے جن کے جواب وہ اس حالت میں بھی تحریر فرماتے، اور دیوبند سے اگرچہ وہ زیادہ سامان ساتھ نہ لا سکے تھے، لیکن اہم کتابیں، مخطوطات، قلمی مسودے اور بزرگوں کے خطوط اور تبرکات کو بڑے اہتمام سے ساتھ لائے تھے، اور فرمایا کرتے تھے کہ کسٹم کی تلاشی میں مجھے سب سے زیادہ فکر ان کتابوں اور کاغذات کی تھی، لیکن کسٹم والوں کو ان سے کوئی غرض نہیں تھی انہیں تو یہ فکر تھی کہ کوئی سونا چاندی یا بے سلا کپڑا نہ جانے پائے۔ اس طرح والد صاحبؒ کا یہ علمی اثاثہ بڑی حد تک ان کے ساتھ آگیا تھا، یہاں تک کہ شیخ الاسلام حضرت علامہ شبیر احمد صاحب عثمانی، رحمۃ اللہ علیہ، اپنے ساتھ اتنی کتابیں نہیں لا سکے تھے، اس لئے بعض اوقات کسی مسئلے کی تحقیق کی ضرورت پڑتی، تو وہ تین منزل کا زینہ چڑھ کر ہمارے گھر تشریف لاتے اور مطالعہ فرماتے۔

رفتہ رفتہ اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے یہ مسائل اس طرح حل ہونے شروع ہوئے کہ حضرت والد صاحب، رحمۃ اللہ علیہ، کے کچھ دوستوں نے کراچی ہی میں کتابوں کی نشرواشاعت کا ایک ادارہ حضرت والد صاحب، رحمۃ اللہ علیہ، کے ساتھ شرکت میں قائم کیا، اور دوسری طرف بھائی جان مرحوم جو دیوبند کا کتب خانہ چلا رہے تھے، کسی طرح ان کے لئے ممکن ہوگیا کہ وہ کتب خانے کو وہاں سے سمیٹ کر پاکستان چلے آئیں، اور ہماری دادی صاحبہ، رحمہا اللہ تعالیٰ، کو بھی اپنے ساتھ لے آئیں۔ چونکہ ان کے لئے ریل کا سفر قابل برداشت نہ تھا، اس لئے وہ انہیں دہلی سے ہوائی جہاز میں لیکر آئے۔ وہ ہم سب گھر والوں کی خوشی کا ناقابل فراموش دن تھا جب ہم اُن کے استقبال کے لئے ڈرگ روڈ کے ہوائی اڈے روانہ ہوئے۔ ڈرگ روڈ کا ہوائی اڈہ اُس وقت شہر سے بہت دور سمجھا جاتا تھا، اور بیچ میں جنگل حائل تھے۔ اُس وقت اورینٹ ائیرویز کے نام سے ایک ہی ائیرلائن پاکستان اور ہندوستان کے درمیان چلا کرتی تھی۔ اُس کا ڈکوٹا طیارہ رن وے پر آکر رُکا، تو میرے لئے کسی جہاز کو اتنے قریب سے دیکھنے کا یہ پہلا موقع تھا۔ ہم سب کی نگاہیں اُس کے دروازے پر مرکوز تھیں، تھوڑی دیر بعد بھائی جان دروازے سے نمودار ہوئے، اور مسکراتے ہوئے چہرے کے ساتھ ہاتھ ہلاکر دوبارہ اندر چلے گئے۔ تھوڑی دیر میں وہ باہر آئے تو اُنہوں نے ہماری دادی صاحبہ کو اپنے بازوؤں میں اُٹھایا ہوا تھا۔ اور اس طرح حضرت والد صاحب، رحمۃ اللہ علیہ، کی ایک بڑی پریشانی رفع ہوئی۔

بھائی جان اپنے ساتھ جتنی کتابیں ہوائی جہاز میں لا سکتے تھے، وہ تو لے آئے تھے، لیکن سارا ذخیرہ پانی کے جہاز ہی سے آسکتا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی یہ صورت پیدا فرمائی کہ حضرت والد صاحب، رحمۃ اللہ علیہ، کے ایک خصوصی شاگرد حضرت مولانا نور احمد صاحب (رحمۃ اللہ علیہ) جو برما کے ضلع اکیاب سے تعلق رکھتے تھے، تعلیم کی غرض سے دارالعلوم دیوبند تشریف لائے تھے، ان کا حضرت والد صاحب، رحمۃ اللہ علیہ، سے خصوصی تعلق تھا۔ حضرت والد صاحب، رحمۃ اللہ علیہ، نے چونکہ پاکستان کی تحریک میں شمولیت اختیار کرلی تھی، اور انہیں دارالعلوم میں رہتے ہوئے کسی سیاسی جدوجہد میں شریک ہونا منظور نہیں تھا، اس لئے وہ اپنے شیخ حضرت حکیم الامت تھانوی، قدس سرہ، کے ایماء پر دارالعلوم دیوبند سے مستعفی ہو چکے تھے۔ حضرت مولانا نور احمد صاحبؒ کو چونکہ حضرت والد صاحبؒ سے خصوصی تعلق تھا، اس لئے وہ غالباً خارجی اوقات میں حضرت والد صاحبؒ سے کچھ کتابیں بھی پڑھتے تھے، اور بکثرت اُن کی خدمت اور صحبت میں رہا کرتے تھے۔ وہ

حضرت والد صاحب، رحمۃ اللہ علیہ، کے پاکستان چلے جانے سے بہت مغموم تھے، اور خود بھی پاکستان آنا چاہتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں مہم جوئی اور محنت ومشقت کے کام نہایت پھرتی سے کرنے کا بڑا ذوق عطا فرمایا تھا۔ اُنہوں نے یہ کام اپنے ذمے لیا کہ وہ یہ کتابیں پانی کے جہاز سے پاکستان لے کر آئیں، چنانچہ ایسا ہی ہوا، اوران کے ذریعے یہ کتب خانہ کراچی منتقل ہوگیا، اُن کے ساتھ حضرت والد صاحب، رحمۃ اللہ علیہ، نے اپنے بھانجے جناب فخر عالم صاحب (مرحوم) کو بھی جہاز سے بلوالیا جو والدین کی وفات کے بعد ہماری دادی صاحبہ مرحومہ کے زیر پرورش تھے، مگر ان کے پاکستان آنے کی وجہ سے دیوبند میں اپنی خالہ کے پاس رہ گئے تھے، اور ان کی جدائی کی وجہ سے ہماری دادی صاحبہ بہت بے چین تھیں۔ حضرت والد صاحب، رحمۃ اللہ علیہ، نے مناسب سمجھا کہ حضرت مولانا نور احمد صاحب، رحمۃ اللہ علیہ، کے ساتھ انہیں بھی بلوالیں۔ چنانچہ وہ بھی بحری جہاز سے ان کے ساتھ آگئے۔

میری تعلیم کا آغاز

حضرت شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد صاحب عثمانی، رحمۃ اللہ علیہ، کا کراچی میں اپنا گھر تو کوئی نہیں تھا، لیکن جمشید روڈ کی عامل کالونی میں مسلم لیگ کے ایک لیڈر ایس ایم قریشی صاحب مرحوم کا ایک بنگلہ تھا جس کے بارے میں انہوں نے فرمائش کی تھی کہ حضرتؒ اس میں قیام فرمائیں۔ چنانچہ حضرتؒ اُسی میں مقیم تھے، اور حضرت والد صاحب، رحمۃ اللہ علیہ، کراچی آنے کے بعد نوزائیدہ ملک کے مسائل پر مشوروں کیلئے بکثرت اُن کے گھر جایا کرتے تھے، اور حضرتؒ کی دعاؤں کیلئے اکثر مجھے بھی ساتھ لے جایا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ مجھے یاد ہے کہ میں قاعدۂ بغدادی ایک خوبصورت سے جُزدان میں رکھ کر حضرتؒ کے سامنے بیٹھا تھا، اور غالب گمان یہ ہے کہ حضرت والد صاحب، رحمۃ اللہ علیہ، اُس وقت مجھے حضرتؒ سے بسم اللہ کرانے کیلئے لیگئے تھے۔

ادھر حضرت مولانا احتشام الحق صاحب، رحمۃ اللہ علیہ، نے جیکب لائن میں ایک مسجد بنائی تھی جس کی چھت اُس وقت ٹین کی چادروں کی تھی، اور اُسی کے ساتھ اُن کا مکان بھی تھا۔ اس مسجد میں اُنہوں نے ایک چھوٹا سا مدرسہ بھی قائم کرلیا تھا جس میں قرآن کریم حفظ وناظرہ کی تعلیم ہوتی تھی۔ حضرت والد صاحب، رحمۃ اللہ علیہ، نے میرے بڑے بھائیوں کو تو اُس مدرسے میں داخل کردیا تھا جہاں برادر محترم جناب محمد ولی رازی صاحب قاری محمد زکریا صاحبؒ کے پاس اور حضرت مولانا مفتی محمد رفیع صاحب عثمانی جناب حافظ نذیر احمد صاحبؒ کے پاس حفظ کرتے تھے۔ میری کمسنی کی وجہ سے حضرت والد صاحب، رحمۃ اللہ علیہ، نے مجھے اُس

وقت وہاں باقاعدہ داخل کرنے کے بجائے گھر پر ہی حضرت مولانا نوراحمد صاحب، رحمۃ اللہ علیہ، سے قاعدہ بغدادی پڑھوانا شروع کردیا تھا۔

ابھی قاعدہ ختم نہیں ہوا تھا، بلکہ اُس کا خاصا حصہ باقی تھا کہ دیوبند سے ایک خط کے ذریعے یہ معلوم ہوا کہ میری ایک بھانجی نے (جو مجھ سے ایک سال عمر میں بڑی تھیں) الف لام میم کا پارہ شروع کردیا ہے، میں پہلے عرض کرچکا ہوں کہ حضرت مولانا نوراحمد صاحب، رحمۃ اللہ علیہ، مشکل سے مشکل کام کو تیز رفتاری سے انجام دینے کے عادی تھے۔ جب انہیں یہ معلوم ہوا کہ میری تقریباً ہم عمر بھانجی نے دیوبند میں الف لام میم کا پارہ شروع کردیا ہے، تو اُنہوں نے فرمایا کہ تم قاعدہ کافی پڑھ چکے ہو، اب تمہیں عم کا پارہ شروع کروادیتے ہیں، چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ قاعدہ ختم کرنے سے پہلے ہی میں نے عم کا پارہ شروع کردیا۔ حضرت مولانا نوراحمد صاحب، رحمۃ اللہ علیہ، اس طرح مجھے ناظرہ قرآن کریم پڑھاتے رہے، یہاں تک کہ میرے سات پارے مکمل ہوگئے۔ اس موقع پر اُنہوں نے فرمایا کہ اب تمہیں لفظوں کی پہچان ہوگئی ہے، اس لئے باقی قرآن کریم تم خود روزانہ پڑھ لیا کرو، اور اُس کے بعد اُنہوں نے مجھے بہشتی زیور کے اردو قاعدے سے سرسری گذار کر "بہشتی گوہر" شروع کرادیا۔

مجھے یاد ہے کہ جب میں نے "بہشتی گوہر" شروع کیا تو اُس کا پہلا جملہ یہ تھا کہ "یہ عالم شروع میں ناپید تھا" اس میں "ناپید" کا مطلب سمجھنے میں مجھے کافی دشواری پیش آئی، اور میں اُس کا مطلب سمجھنے کے لئے اپنے استاذ سے کافی جرح کرتا رہا۔ بہر کیف! ابھی اس کے کچھ ہی سبق ہوئے تھے کہ حضرت مولانا احتشام الحق صاحب، رحمۃ اللہ علیہ، نے اپنے مدرسے میں کتابوں کی تعلیم بھی شروع کروادی، اور رفتہ رفتہ یہاں باقاعدہ درس وتدریس کا سلسلہ شروع ہوگیا، جہاں حضرت مولانا بدر عالم صاحب، رحمۃ اللہ علیہ، جیسے اکابر نے بھی درس دیا، اور شاید کچھ عرصہ حضرت والد صاحب، رحمۃ اللہ علیہ، نے بھی، اور حضرت مولانا نوراحمد صاحب، رحمۃ اللہ علیہ، وہاں تعلیم دینے میں مصروف ہوگئے، اس لئے میں نے "بہشتی گوہر" اور "سیرت خاتم الانبیاء" کے کچھ حصے اپنی والدہ ماجدہ، رحمۃ اللہ علیہا، سے پڑھنے شروع کردیئے اور اب یاد نہیں کہ کتنا حصہ کس سے پڑھا، اور یہی میری اردو زبان کی تعلیم کی کل کائنات تھی۔ ان دو کتابوں کے علاوہ میں نے اردو سیکھنے کیلئے کوئی اور کتاب نہیں پڑھی۔

دوسری طرف میں روزانہ قرآن شریف اپنے طور پر پڑھتا رہتا تھا۔ میں قرآن شریف کو تکیہ پر رکھ کر

چارپائی پر بیٹھتا، اور روزانہ اُس کا کچھ حصہ پڑھ لیتا تھا، اور کبھی کبھی اپنی والدہ صاحبہؒ یا گھر کے کسی اور فرد کو سنا بھی دیتا تھا، یہاں تک کہ اسی طرح خود پڑھ پڑھ کر ایک صبح الحمدللہ ناظرہ قرآن کریم کی تکمیل ہوگئی۔

میں دیکھتا تھا کہ جب بچوں کا قرآن کریم ناظرہ یا حفظ مکمل ہوتا، تو عموماً اُس کیلئے باقاعدہ تقریب منعقد ہوتی تھی، جسے "آمین" کی تقریب کہا جاتا تھا، اور بسا اوقات مٹھائی تقسیم کرکے خوشیاں منائی جاتی تھیں، لیکن میں نے قرآن کریم ناظرہ کی تعلیم اس طرح مکمل کی کہ جس دن میری یہ "خودکار" پڑھائی مکمل ہوئی، اُس دن کسی کو پتہ بھی نہیں تھا کہ آج میرا قرآن کریم ختم ہورہا ہے۔ مجھے اپنے دل کی یہ حسرت اب تک یاد ہے کہ میں نے اکیلے کمرے میں آخری آیات پڑھ کر قرآن شریف بند کردیا، نہ کوئی دیکھنے والا تھا، نہ سننے والا، نہ کوئی تقریب تھی، نہ کوئی اجتماع۔

آخرکار میں نے حضرت والد صاحب، رحمۃ اللہ علیہ، کو بتایا کہ آج میرا قرآن کریم پورا ہوگیا ہے، تو وہ بہت خوش ہوئے، اور انہوں نے مجھے انعام دینے کے لئے میرے دو بڑے بھائیوں (مولانا محمد ولی رازی اور حضرت مفتی محمد رفیع عثمانی مدظلہما) کو بازار بھیجا۔ میں اپنے گھر کی بالکنی میں کھڑا اُن کی واپسی کا شدت سے انتظار کرتا رہا، یہاں تک کہ وہ دُور سے مجھے آتے نظر آئے، تو اُن کے ہاتھ میں ایک نیلے رنگ کی کھلونے والی گاڑی تھی جس سے وہ خود بھی راستے میں محظوظ ہوتے آرہے تھے۔ اُسے پاکر میری خوشی کا کچھ ٹھکانا نہیں تھا۔ وہ ایک معمولی سی مگر خوبصورت گاڑی تھی (اُس وقت تک شاید خودکار گاڑیاں نہیں چلی تھیں) لیکن وہ میرے لئے کائنات کی بڑی دولت تھی۔ اب احساس ہوتا ہے کہ انسان اپنی فانی زندگی کے ہر مرحلے میں جن چیزوں سے دل لگاتا آیا ہے، اگلے مرحلے میں اُس پر ہنسی آتی ہے، یہاں تک کہ ایک وقت وہ آنے والا ہے جب یہ ساری زمین، جائیداد اور روپے پیسے کے ڈھیر کھلونوں سے زیادہ بے حقیقت معلوم ہونگے:

بدنامئی حیات دو روزے نہ بود بیش
آں ہم بتو کلیم چہ گویم چساں گذشت

یک روز وقفِ بستنِ دل شود بہ این و آں
روز دگر بہ کندنِ دل زین و آں گذشت

بہر حال! اس طرح میری تعلیم کا آغاز ہوا۔

☆☆☆